5

ان باتوں کی طرف توجہ کرو جن کے نتیجہ میں روحانی یا مادی فوائد حاصل ہو سکیں

(فرمودہ 14 فروری 1941ء)

تشہّد، تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

"اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر احسان ہے اور بہت ہی بڑا احسان ہے۔ اتنا بڑا احسان کہ انسان اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتا کہ اس نے اپنے فضل اور کرم سے انسانی دماغ کو ان الجھنوں اور پریشانیوں سے بچا لیا ہے جن کا شکار ہونا اس کی مدد کے بغیر اس کے لئے لازمی اور ضروری تھا۔ اور واقعات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ جنہوں نے خدا تعالیٰ کی مدد لینے سے انکار کر دیا ان کے دماغ انہی الجھنوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ صرف وہی ان الجھنوں سے محفوظ ہیں جنہوں نے الٰہی مدد کو قبول کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس مرض سے بچایا ہے۔ انسان اس دنیا میں جسے وہ کسی وقت سب سے بڑی چیز سمجھا کرتا تھا پیدا ہوا تو سورج اسے ایک تھال نظر آتا تھا چاند اسے تھالی کی مانند دکھائی دیتا اور ستارے اسے کوئی دانوں کے برابر، کوئی بیروں کے برابر اور کوئی اخروٹوں اور کوئی سیبوں کے برابر نظر آتے تھے۔ زمین کی جھاڑیاں اور درخت بھی اسے سورج چاند اور ستاروں سے بڑے معلوم ہوتے تھے۔ اس کے لئے یہ بات حیرت انگیز تھی کہ دور جہاں تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا، پہاڑوں پر چڑھ کر بھی نہیں پہنچ سکتا تھا ایک چھوٹی سی ٹکیا نمودار ہو کر ساری دنیا کو روشن کر دیتی ہے اور رات کے وقت ایک چھوٹی سی سفید تھالی ظاہر ہو کر سارے عالم کو چاندنی سے بھر دیتی ہے۔ ہزاروں ہزار ٹمٹمانے

والے ستارے جَوّ میں پھیل جاتے ہیں اور چمک چمک کر اس کی آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں۔اس کی نظر کے لئے دلفریب نظارہ پیدا کرتے اور جب دن آتا تو غائب ہو جاتے ہیں۔ یقینا یہ چیزیں اسے حیرت میں ڈالنے والی تھیں اور حیرت میں ڈالنے والی ہوتیں اگر خدا تعالیٰ کا ہاتھ ابتدا میں ہی اسے پکڑ کر سیدھا رستہ نہ دکھا دیتا۔ ہم دیکھتے ہیں گھر میں کوئی معمولی سا کھٹکا ہوتا ہے تو گھر والے اٹھ کر تجسّس شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے چوہا ہو گا اور کوئی کہتا ہے چور ہو گا۔ایک معمولی سا کھٹکا چھپکلی اور چوہے سے لے کر چور تک پہنچا دیا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے نظارے اسے کس طرح حیران کر سکتے تھے مگر جونہی کہ انسانیت سنِ شعور کو پہنچی اور جونہی پہلا انسان سنِ شعور کو پہنچا اللہ تعالیٰ نے اس کے کان میں یہ آواز ڈال دی کہ مَیں تیرا اللہ ہوں جس نے یہ سب دنیا پیدا کی ہے۔ اور جو کچھ تجھے نظر آتا ہے یہ سب میری مخلوق ہے جس طرح کہ تُو مخلوق ہے۔ اور تُو ایک دن مر کر میرے سامنے آنے والا ہے۔ یہ سب چیزیں جو تجھے نظر آتی ہیں خواہ قریب ہوں خواہ دور مَیں نے تیرے فائدے اور تیرے کام آنے کے لئے پیدا کی ہیں اور سب تجھے نفع پہنچانے کے کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔ اس آواز نے اسے کتنی پریشانیوں سے بچا لیا۔ اگر پہلا انسان یعنی آدم اپنے سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد اس آواز کو نہ سنتا تو اس کے لئے کس قدر مصیبت ہوتی اور وہ کتنی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا۔ دن چڑھتا تو اس کے لئے ایک تکلیف کا آغاز ہو جاتا کہ سورج کی کُنہ کو معلوم کرے اور رات ہوتی تو ایک پریشانی کا دروازہ کھل جاتا کہ چاند کی حقیقت کو معلوم کرے اور پھر یہ پتہ لگائے کہ ان چیزوں کا اس سے کیا تعلق ہے؟ یہ اسے کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہیں یا نہیں؟ اس سے خوش یا ناراض ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ اور ہم دیکھتے ہیں کہ جنہوں نے اس آواز سے فائدہ نہیں اٹھایا وہ ان چکروں میں پڑ گئے ہیں۔ ہزارہا بُت پرست قومیں ان الجھنوں میں مبتلا ہیں۔ کوئی کہتی ہے کہ چاند اور سورج پر ارواح چھا جاتی ہیں اور وہ ناراض یا خوش ہوتی ہیں۔ نہ ہم سورج اور چاند تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ وہ اپنا منشاء ہم پر ظاہر کر سکتے ہیں۔ نہ ہم یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس طرح خوش اور کس طرح ناراض ہوتی ہیں۔ آج کسی شخص نے کوئی کام کیا جس کا نتیجہ خراب نکل آیا

تو اس نے خیال کر لیا کہ چاند پر چھائی ہوئی ارواح کو یہ بات پسند نہیں آئی اور کسی نے کوئی کام کیا جس کا نتیجہ اچھا نکلا تو اس نے سمجھ لیا کہ سورج کی روح کے نزدیک یہ کام اچھا ہے۔ نہ تو چاند نے خود بولنا ہے اور نہ سورج نے اور نہ ان ارواح نے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ان پر چھا جاتی ہیں۔ مگر آدم کیسا مطمئن تھا اور بشاشت قلب سے بیٹھا تھا کیونکہ اسے خدا تعالیٰ نے بتا دیا تھا کہ یہ سب چیزیں اس نے اس کے لئے مسخر کر دی ہیں اور یہ اس کی خدمت پر لگی ہوئی ہیں۔ اس لئے اسے سورج اور چاند کی ناراضی یا خوشنودی کے سامانوں کی تلاش میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ موحّد اور خدا رسیدہ آدم ان سب پریشانیوں سے مامون و محفوظ تھا اور ان سامانوں سے فائدہ اٹھانے اور خدا تعالیٰ کی عبادت میں لگا ہؤا تھا نہ سورج کا چڑھنا اور نہ اس کا ڈوبنا اس کے دل میں کوئی گھبراہٹ پیدا کر سکتا تھا۔ سورج اور چاند کا چڑھنا اور غروب ہونا اس کے لئے ایسا ہی تھا جیسا اس کا اپنا سونا اور جاگنا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سب مادی چیزیں ہیں جو خدا تعالیٰ نے میرے فائدہ کے لئے پیدا کی ہیں۔ یہ بھی ویسی ہی ہیں جیسے گھوڑے، گائیں وغیرہ ہیں۔ نہ ان کی خوشی میرے لئے کسی نفع کا اور نہ ناراضگی کسی نقصان کا موجب ہو سکتی ہے۔ مگر دوسروں نے کس کس رنگ میں ان چیزوں کے وجود پر بحثیں کی ہیں۔ ہندوستان کے فلسفیوں کو ہی لے لو حیرانی ہوتی ہے کہ کس طرح ایک ایک چیز کے متعلق انہوں نے مختلف نظریات قائم کئے ہیں اور وہ کس کس قسم کی الجھنوں میں پڑے رہے ہیں۔ یونانی فلسفہ کو دیکھو یہی حالت وہاں ہے۔ قیاس اور وہم سے پیدا شدہ مختلف باتیں ان کو پریشان کرتی رہی ہیں۔ اگر تو یہ تجسس ہو کہ سورج ایک مادی چیز ہے اس کی شعاعوں میں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا فائدے رکھے ہیں تو یہ ایک سائنس کی تحقیقات ہے اس میں گھبراہٹ کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ جو اس میں لگا ہے اگر تو وہ تاجرانہ ذہنیت کا ہے تو سمجھتا ہے کہ اگر کامیاب ہو گیا تو اس تحقیقات کو فروخت کر کے مالی فائدہ حاصل کروں گا۔ اگر علمی مذاق رکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ علمی کتاب شائع کروں گا لوگ میری قدر کریں گے۔ لیکن اگر کامیاب نہ ہؤا اور معلوم نہ کر سکا تو بھی کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ میرے باپ دادوں کو بھی تو یہ علم نہ تھا اور اس کے

نہ ہونے سے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن اگر وہ ان چیزوں کو ہی خدا کا مرتبہ دیتا اور سمجھتا ہے کہ ان کا تعلق اس کی زندگی موت سے ہے یہ اس کے اور اس کے بیوی بچوں کے آرام و راحت پر اثر انداز ہوتی ہیں تو اسے دن رات ایک خلش رہے گی کہ پتہ نہیں مجھے یہ چیزیں کیا نقصان پہنچائیں غیر معروف چیزیں معروف کی نسبت ہمیشہ زیادہ گھبراہٹ کا موجب ہوتی ہیں۔ انسان سامنے آنے والے دشمن سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا پوشیدہ سے۔ لوگ تلوار کے ساتھ سامنے سے حملہ کرنے والے سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا چور سے ڈرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ چور بڑا بہادر ہوتا ہے بلکہ بعض چور مسلول ہوتے ہیں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ایک تندرست آدمی تھپڑ مارے تو چھ سات دانت ٹوٹ جائیں مگر پھر بھی لوگ چور سے بہت ڈرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ علم نہیں ہوتا کہ وہ کہاں سے آئے گا کس طرح آئے گا، کس طرح نقصان پہنچائے گا۔ ایک شخص بیمار ہوتا ہے ڈاکٹر بتا دیتا ہے کہ اسے پتھری ہے اور سب متعلقین کو گونہ اطمینان ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ بیماری کا پتہ لگ گیا اب ہسپتال جا کر اپریشن کرائے گا اور آرام ہو جائے گا۔ لیکن ایک اور شخص کو معمولی بخار ہوتا ہے ڈاکٹر کہتا ہے کچھ پتہ نہیں لگتا کہ بخار کیوں ہوا؟ اور سب گھر والے پریشان ہو جاتے ہیں۔ یہ گھبراہٹ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ بخار کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی مگر پتھری سے اتنی گھبراہٹ نہیں ہوتی کیونکہ اس کا پتہ لگ چکا ہے اور آدمی سمجھتا ہے کہ علاج سے آرام ہو جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ماننے والوں کو بھی بعض دفعہ گو گھبراہٹ ہوتی ہے کہ فلاں نافرمانی ہو گئی ہے اس کی سزا نہ مل جائے۔ ہم اپنے خالق کے منشاء کو اچھی طرح پورا کر سکیں گے یا نہیں مگر یہ معیّن حد تک ہوتی ہے لیکن جسے پتہ ہی نہیں کہ خدا تعالیٰ کیونکر ناراض ہوتا ہے اور اسے خوش کرنے کے ذرائع کیا ہیں؟ وہ کیا ذرائع اور اعمال ہیں جن سے انسان اللہ تعالیٰ سے قریب اور بعید ہو جاتا ہے ؟اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اکیلا جنگل میں بیٹھا ہو، چاروں طرف سے آوازیں آ رہی ہوں کہ اس پر چور ڈاکو اور جانور حملہ کرنے والے ہیں مگر اسے پتہ نہ ہو کہ اس پر حملہ کب ہو گا؟ کس طرف سے ہو گا؟ شیر کرے گا یا بھیڑیا، چور کرے گا یا کوئی درندہ؟

ایک مثال لڑائی کی ہمارے سامنے ہے۔ تجربہ سے ظاہر ہے کہ جو قوم حملہ کرتی ہے وہ زیادہ مطمئن ہوتی ہے بہ نسبت اس کے جو دفاع کرتی ہے۔ اٹلی کو اس لڑائی میں پے در پے شکستیں ہو رہی ہیں۔ ماہرین کی رائے اس کے متعلق یہ ہے کہ اٹلی کی فوجوں کو حملہ کرنا نہیں آتا وہ صرف دفاع کر سکتی ہیں اور اسی طرف متوجہ رہتی ہیں۔ حملہ آور اگر دس ہوں اور دفاع کرنے والے ایک ہزار تو بھی ان کا پہلو کمزور رہے گا ان کو کھٹکا لگا رہے گا کہ معلوم نہیں دس حملہ آور کس طرف سے حملہ کریں۔ جنوب سے کریں، شمال سے کریں، مشرق سے کریں یا مغرب سے۔ اور پھر ان اطراف کے بھی کس گوشہ سے کریں۔ ان میں سے ہر دس آدمی ہوشیار رہیں گے اور ڈرتے رہیں گے۔ لیکن اگر ہزار نے دس پر حملہ کرنا ہو تو وہ اتنے پریشان نہیں ہوں گے۔ دس پندرہ آدمی بھیج دیں گے کہ جا کر حملہ کر دو اور باقی اطمینان کے ساتھ بیٹھے رہیں گے مگر دفاع کرنے والے خواہ زیادہ ہی ہوں گھبراہٹ میں رہیں گے کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ حملہ کس طرف سے ہو گا۔ یہی فرق خدا تعالیٰ کے ماننے اور نہ ماننے والوں میں ہے۔ جو مانتا ہے اسے پتہ ہے کہ خطرہ کہاں سے آئے گا اور اس سے بچنے کا کیا طریق ہے۔ مگر جو نہیں مانتا وہ صرف قیاسی گھوڑے دوڑاتا ہے۔ وہ ہر ذرہ کو خدا سمجھتا اور اس سے ڈرتا ہے۔ وہ قدم قدم پر امیدیں باندھتا اور قدم قدم پر ان کو مٹاتا ہے اور قدم قدم پر خوف اس کی جان نکالتا ہے۔

پس یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے آدم کے سنِ شعور کو پہنچنے کے ساتھ ہی اس پر الہام نازل کر کے اسے بتا دیا کہ یہ سب کچھ میری مخلوق اور تمہارے فائدہ کے لئے ہے اور پھر ہر نبی کے ذریعہ یہ پیغام پہنچاتا رہا اور اس زمانہ میں بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ اس نے یہ آواز سنائی ہے۔ بے شک آپ کے ماننے والوں کو بھی خطرات پیش آتے ہیں مگر وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو دور کرنے اور اس کے انعامات کے وارث بننے کے کیا ذرائع ہیں۔ ان کو اپنی غلطی کا علم ہو جائے تو وہ جانتے ہیں کہ اس کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے اور

کس طرح ترقی کی جا سکتی ہے مگر جن لوگوں نے اپنی عقل سے کام لیا وہ جس گھبراہٹ کا شکار ہوتے ہیں اس کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان اس کا کوئی نظارہ دیکھے۔

کل ایک ہندو صاحب مجھ سے ملنے آئے نہ معلوم اس کی کیا وجہ تھی۔ وہ کانپور کے رہنے والے تھے ان کے لڑکے کو پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔ بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ چونکہ چوہدری سر ظفر اللہ خان صاحب اس جماعت میں ہیں مَیں ان کے پاس سفارش کر دوں گا اور ان کا کام ہو جائے گا اور وہ شاید سمجھتے ہیں کہ ساری دنیا کا کام چوہدری صاحب کے ہی سپرد ہے اس لئے مَیں ایسے لوگوں سے ملا نہیں کرتا۔ مگر ان کے متعلق بتایا گیا کہ وہ صرف دعا کرانا چاہتے ہیں سفارش نہیں۔ اس لئے مَیں نے ان کو ملاقات کا موقع دے دیا۔ وہ آئے اور بیٹھ گئے اور ذکر کیا کہ ان کا لڑکا کانگرسی تھا، زمینداروں کے معاملات میں بہت دلچسپی لیتا تھا اور کسانوں کی زمینداروں کے مقابلہ میں بہت حمایت کیا کرتا تھا۔ کسی جگہ کسانوں نے ایک زمیندار کو ہلاک کر دیا اور چار کسانوں کے ساتھ اس کو بھی اس الزام میں پکڑ لیا گیا اسے بھی پھانسی کی سزا ہوئی جو ہائی کورٹ تک بحال رہی اور اب رحم کی اپیل بھی مسترد ہو چکی ہے۔ یہ ان کا بیان تھا۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ صحیح ہے یا محض والد ہونے کی وجہ سے وہ ایسا سمجھتے تھے کہ ان کا لڑکا اس جرم میں شریک نہ تھا۔ محض اس وجہ سے اسے دھر لیا گیا کہ وہ کانگرسی تھا اور زمینداروں کے خلاف کسانوں کا ہمدرد تھا۔ وہ جب باتیں کر رہے تھے تو مَیں نے دیکھا کہ ان کی آخری امید بھی قریباً جاتی رہی تھی اوران کے اندر ایک گھبراہٹ اور اضطراب تھا اور مَیں نے پوچھا تو نہیں مگر میرا قیاس ہے کہ شاید ان کا یہی ایک لڑکا تھا۔ وہ بوڑھے آدمی ہیں۔ اسی گھبراہٹ اور اضطراب میں باتیں کرتے کرتے انہوں نے کہا کہ معلوم نہیں بھگوان کہاں سو رہے ہیں؟ پھر تھوڑی دیر خاموشی کے بعد کہا معلوم نہیں مجھے کس جنم کے کون سے گناہ کی سزا مل رہی ہے۔

ان کے ان دونوں فقروں نے مجھے ایسی حیرت میں ڈال دیا کہ مَیں ان کے متعلق اپنے معمولی فرض کو بھی بھول گیا۔ مَیں نے ان سے ہمدردی کا اظہار تو کیا اور ان سے کہا کہ مَیں دعا کروں گا مگر جس قدر ہمدردی ظاہر کرنی چاہئے تھی نہ کر سکا۔ کیونکہ ان دونوں فقروں کی گہرائیوں میں میرے خیالات اُلجھ گئے اور مَیں سوچنے لگا کہ الہامی اور غیر الہامی مذاہب میں کتنا فرق ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَاتَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ 1 یعنی اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ مگر بعض دوسرے مذاہب والے یہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ سوتا بھی ہے اور جاگتا بھی۔ اس لئے یہ شخص حیران ہے کہ میرا بیٹا پھانسی پا رہا ہے اور خدا معلوم نہیں کس جگہ سویا ہوا ہے۔ مَیں اسے امداد کے لئے بلاؤں بھی تو کیسے؟ معلوم نہیں وہ کس جگہ سو رہا ہے۔ مسلمان جانتا ہے کہ اگر مجھے کوئی سزا بھی مل رہی ہے تو اس میں میرا کوئی قصور ہو گا۔ اور اگر قصور نہیں ہے تو میرا خدا سویا ہوا نہیں بلکہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور وہ ضرور میری مدد کرے گا اور اس سے اس کا دل مطمئن ہوتا ہے۔

ماؤں کے بچے مر بھی جاتے ہیں اور گم بھی ہو جاتے ہیں مگر جس کا بچہ مر جائے وہ چندروز میں غم کو بھول جاتی اور کام کاج کرنے لگتی ہے مگر جس کا بچہ گم ہو گیا ہو وہ ہر وقت اس کے غم میں پریشان رہتی ہے کیونکہ اسے ہر وقت یہی گھبراہٹ رہتی ہے کہ معلوم نہیں وہ کس حال میں ہو گا کسی ظالم کے پنجہ میں ہو گا۔ معلوم نہیں وہ اسے کتنی تکلیف دے رہا ہو گا، اسے مارتا پیٹتا ہو گا یا اگر کوئی لڑکی ہو تو وہ ہر وقت اسی خیال میں رہتی ہے معلوم نہیں کہ کن ظالموں سے اس کو پالا پڑا ہو گا جو تمام دن اس سے کام لیتے ہوں گے اور رات کو اس سے دبواتے ہوں گے۔ خواہ وہ مر ہی چکی ہو مگر چونکہ اسے علم نہیں ہوتا اس لئے وہ ہر وقت یہی خیال کرتی ہے کہ وہ تکلیف میں ہو گی اور اس لئے پریشان رہتی ہے اور ہر وقت اسے یہی غم لگا رہتا ہے۔

امید کا منقطع ہو جانا بھی ایک لحاظ سے آرام کا موجب ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جو شخص جانتا ہے کہ میرا خدا جاگتا ہے اور سب کچھ دیکھتا ہے وہ کسی وقت سوتا نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے شاید مجھے سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس طرح وہ اس ماں کی طرح جو جانتی ہے کہ اس کا بچہ مر چکا ہے مطمئن ہو جاتا ہے۔ مگر جو لوگ خیال کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ سو بھی جاتا ہے وہ اسی تردّد میں رہتے ہیں کہ خدا تو شاید سو رہا ہے اور اس کے جگانے کی کوئی ترکیب ہمیں معلوم نہیں۔ پھر یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں سو رہا ہے؟ کونسا دروازہ کھٹکھٹائیں اور کس مکان پر جا کر اسے جگائیں؟ ادھر ہمارے بچہ کے پھانسی پانے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ یہ کیسی اضطراب کی کیفیت ایسے لوگوں پر طاری ہوتی ہے۔ اور وہ کیسی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں؟ اور یہ سارا ظلم ان کم بخت فلاسفروں نے ان پر کیا ہے جنہوں نے یہ خیالات ان کے اندر پیدا کئے۔ ایسے لوگ سخت سے سخت سزا کے مستحق ہیں جنہوں نے جاہل لوگوں کو ایسے خیالات میں مبتلا کر کے ان کا چین اور سکھ برباد کر دیا۔ وہ تو اپنے خیال میں ایک علمی مشغلہ میں لگے تھے اور دنیا کی پہیلی حل کرتے تھے مگر دراصل انہوں نے لاکھوں انسانوں پر شدید ترین ظلم کیا اور ان کا اطمینانِ قلب چھین کر ان کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیا۔

ایک شخص کا بچہ اگر سخت بیمار ہو اور ڈاکٹر علاج کے لئے پاس بیٹھا ہو تو گو اس کے بچہ کی حالت کیسی خطرناک ہو پھر بھی اسے ایک اطمینان ہوتا ہے اور گو اس کی حالت بھی قابلِ رحم ہوتی ہے مگر اس سے بہت زیادہ قابلِ رحم حالت اس انسان کی ہے جس کا بچہ خطرناک طور پر بیمار ہو اور وہ ڈاکٹر کے مکان پر پہنچے تو معلوم ہو کہ وہ سیر کو چلا گیا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جائے تو پتہ لگے کہ گھر واپس چلا گیا ہے اور جب وہ پھر اس کے مکان پر پہنچے تو معلوم ہو کہ وہ کسی اور مریض کو دیکھنے چلا گیا ہے۔ ایسے شخص کی حالت بہت قابلِ رحم ہوتی ہے کیونکہ ایک طرف تو وہ ڈاکٹر کی تلاش میں حیران ہو رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف اسے یہ اضطراب ہوتا ہے کہ بچہ میرے بعد فوت ہی نہ ہو گیا ہو۔ اسی طرح جو شخص جانتا ہے کہ میرا خدا

سوتا نہیں بلکہ جاگتا ہے اور میں اس سے مدد مانگوں تو اگر کسی مصلحت کے خلاف نہ ہو تو وہ ضرور میری مدد کرے گا اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی کے بیمار بچے کے پاس ڈاکٹر موجود ہو۔ ایسے شخص کا بچہ بھی مر سکتا ہے مگر پھر بھی اسے ایک اطمینان ہوتا ہے لیکن جو سمجھتا ہے کہ خدا ممکن ہے میری مدد کے وقت کہاں سویا ہوا ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کا بچہ خطرناک بیمار ہو اور اسے ڈاکٹر نہیں ملتا۔ پس اس شخص کا یہ کہنا کہ معلوم نہیں بھگوان کہاں سوئے ہوئے ہیں بتا رہا تھا کہ اس کے دل میں ایک خلجان ہے کہ یہ کیسی مصیبت ہے کہ بھگوان یہ بھی نہیں بتاتے کہ وہ کہاں سو رہے ہیں۔ مَیں ان کے پاس مدد کے لئے جاؤں بھی تو کہاں جاؤں؟ ادھر میرے بچہ کی پھانسی کا وقت مقرر ہو چکا ہے اور حکومت اس وقت پر ضرور پھانسی دے دے گی۔ پھر یہ معلوم نہیں کہ یہ کس جنم کے قصور کی سزا ہے مگر ایک مسلمان جانتا ہے کہ اس کا خدا سوتا کبھی نہیں ہر وقت جاگتا اور دیکھتا ہے۔ پھر وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جو سزا بھی ملتی ہے اسی جنم کی ملتی ہے۔ بلکہ ضروری نہیں کہ کسی گناہ کی ہی سزا ہو۔ دنیا میں ایک شریعت کا قانون ہے اور ایک طبعی قانون ہے۔ بعض حالتوں میں انسان کو طبعی قانون کے ماتحت دکھ پہنچ جاتا ہے۔ وہ کسی گناہ کی سزا نہیں ہوتی اور جس شخص کا ان باتوں پر ایمان ہو اس کا دل اطمینان سے بھرا ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ استغفار کرو، توبہ کرو، دعائیں کرو تو یہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ مگر جو سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ بھی ایک بنیے کی طرح ہے اس نے ہمارے سب گناہوں کا بھی کھاتہ بنا رکھا ہے اور ضرور ہے کہ ہر گناہ کی کسی نہ کسی جنم میں سزا مل کر رہے۔ خدا تعالیٰ گناہ کی سزا دیئے بغیر چھوڑتا نہیں۔ اس کی حالت کیسی قابلِ رحم ہے اسے ہر وقت فکر رہتا ہے کہ میرا کوئی گناہ معاف تو ہونا نہیں بلکہ ضرور اس کی سزا ملنی ہے معلوم نہیں کس جنم میں کس گناہ کی سزا ملے۔ اب تو بنیوں کی زیادتیاں روکنے کے لئے حکومت نے بعض قوانین بنائے ہیں مگر پہلے یہ نہ تھے اور سینکڑوں ہزاروں لوگوں کو انہوں نے تباہ کیا۔ کئی لوگوں نے

مجھے ایسے واقعات بتائے اور مَیں نے تحقیقات کی تو وہ درست ثابت ہوئے کہ کسی نے کسی بنئے سے کسی وقت تیس چالیس روپے لئے اور تین تین سو روپے ادا کر دیئے پھر بھی اتنی ہی رقم کی ڈگری ان پر ہو گئی۔ انہوں نے ایک وقت روپیہ دے دیا اور بنیے نے کہہ دیا کہ بس حساب صاف ہو گیا۔ انہوں نے غفلت کی اور سمجھ لیا کہ بس حساب صاف ہو چکا لیکن کچھ عرصہ کے بعد بنیا پھر آ گیا۔ اول تو انکار کر دیا کہ مَیں نے حساب صاف ہو جانے کا کہا ہی نہ تھا اور اگر مانا بھی تو کہہ دیا مجھے غلطی لگ گئی تھی۔ دراصل دس روپے باقی رہ گئے تھے جو اب 25 ہو گئے ہیں۔ معمولی زمیندار دس پانچ روپیہ سے زیادہ ایک وقت نہیں دے سکتے۔ اتنے دے دیئے اور بنیا چلا گیا مگر آٹھ دس سال کے بعد بڑھتے بڑھتے پھر وہ روپے سینکڑوں ہو گئے۔ غرضیکہ مشہور ہے کہ بنیے کا حساب کبھی ختم نہیں ہوتا۔

یہی حال خدا تعالیٰ کا ہندو مذہب پیش کرتا ہے۔ وہ کبھی حساب صاف نہیں ہونے دیتا بلکہ کچھ نہ کچھ ضرور بقایا رکھتا ہے۔ پھر بندے کو یہ بھی علم نہیں ہونے دیتا کہ جو سزا اسے مل رہی ہے وہ اس کے پہلے جنم کے کسی ابتدائی گناہ کی ہے یا آخری کی۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ جیل جاؤ مگر یہ نہیں بتاتا کہ جرم کیا ہے نہ یہ کہ جرم کی شدت کیسی ہے، سزا کتنی ہے اور نہ یہ بتاتا ہے کہ سزا سے بچنے کا کوئی ذریعہ بھی ہے یا نہیں۔ یہ بالکل بنیوں والا طریق ہے۔ معلوم نہیں بنیوں نے پرمیشور سے یہ طریق سیکھا یا پرمیشور نے بنیوں سے۔ تو ایسے خیالات نے لاکھوں انسانوں کے قلوب میں بے اطمینانی پیدا کر رکھی ہے۔ آجکل کے تعلیم یافتہ آریہ سماجی جن کے دلوں میں کچھ اطمینان معلوم ہوتا ہے حقیقت یہی ہے کہ وہ تناسخ کو نہیں مانتے۔ بے شک وہ مناظرے کرتے ہیں، بحثیں کرتے ہیں، مگر دل سے ایسے عقائد کے قائل نہیں۔ ورنہ ان کو کبھی اطمینان قلب حاصل نہ ہو سکتا یا اگر مانتے بھی ہیں تو محض فلسفیانہ مسئلہ کی حیثیت سے ورنہ ان کے عقائد وہی ہیں جو مسلمانوں کے ہیں۔ وہ محض دماغی تعیّش کے لئے ان بحثوں میں پڑتے ہیں۔ ان کی عملی زندگی پر اس کا

کوئی اثر نہیں ہوتا۔اور اگر غور سے دیکھا جائے تو تناسخ ماننے والوں کے عقیدہ کے مطابق خدا اور بنئے میں کوئی فرق نہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے بنیا زیادہ نیکی کرتا ہے کیونکہ خواہ وہ دھوکا سے ہی سہی وہ چند سال تو اپنے مقروض کے اطمینان سے گزرنے دیتا ہے۔ جب اسے کہہ دیتا ہے کہ تمہارا حساب اب صاف ہو گیا۔ مگر جس پر میشور کو یہ مذہب پیش کرتا ہے وہ تو کبھی دھوکا سے بھی نہیں کہتا کہ اب تمہارے گناہوں کا حساب صاف ہو چکا ہے۔تو ان فلسفیوں نے اتنا ظلم مخلوق پر کیا ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ دنیا میں ایک انسان کے مارنے والے کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے اور ان نالائقوں نے کروڑوں کروڑ آدمی مار ڈالے ہیں اور پھر ان کو ایک ہی دفعہ نہیں مارا بلکہ کُند چھریوں سے ذبح کیا ہے۔ کسی کو اسّی سال میں، کسی کو ساٹھ اور کسی کو پچاس اور کسی کو چالیس سال میں ذبح کیا ہے۔ صرف اور صرف وہی ہیں جو ان تمام لوگوں کی گھبراہٹ اور اطمینانِ قلب چھیننے کا موجب ہوئے ہیں۔ کیا عجیب بات ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ معلوم نہیں کون سے جنم کی سزا مل رہی ہے۔ یہ غور نہیں کرتے کہ یہی اعمال ہیں جو ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ کیا ہم دیکھتے نہیں کہ آج ایک شخص زیادہ مرچیں کھاتا ہے اور کل اسے پیچش ہو جاتی ہے۔ آج ہی پانی پیتا تو پیاس بجھتی اور روٹی کھاتا ہے تو پیٹ بھرتا ہے۔ یہ سب اسی زندگی کے اعمال کے نتائج ہیں۔ سب اعمال کی وجوہ اور نتائج یہیں نظر آتی ہیں۔ ہاں اگر دوچار کی وجوہ کو ہم نہیں سمجھ سکے تو باقی پر ان کا قیاس بھی کیا جا سکتا ہے جو باقی کی تشریح ہے وہی ان کی سمجھ لینی چاہیئے۔ اگر زندگی میں انسان کو گزشتہ اعمال کا ہی نتیجہ ملتا ہے تو چاہیئے کہ وہ شادی نہ بھی کرے پچھلے جنم کے کسی عمل کے نتیجہ میں اگر اس کے ہاں بچے ہونے ہیں تو ہو جائیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان شادی کرے تب ہی بچہ پیدا ہوتا ہے، پانی پیتا ہے تو پیاس بجھتی ہے، روٹی کھاتا ہے تو پیٹ بھرتا ہے۔ یہ سب اعمال کے نتائج ہیں جو ساتھ ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور طبعی قانون کے نتائج ہیں۔ مثلاً کوئی شخص آگ کے پاس بیٹھے تو اس کے کپڑے گرم ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر ماں باپ کی

صحت خراب ہے تو بیٹا اندھا پیدا ہو گا۔ماں کے رحم میں کوئی نقص ہے تو بیٹے کے ہاتھ کی دو ہی انگلیاں ہوں گی یا پاؤں میں کوئی نقص ہو گا یا اسی طرح کوئی اور نقص ہو گا اور جب تک ماں کے رحم میں وہ نقص رہے جو بچہ پیدا ہو گا اس کا اثر اس پر ہو گا۔ ہاں وہ دور ہو جائے تو پھر تندرست بچے پیدا ہوں گے۔ غرض طبعی نتائج ورثہ میں بھی ملتے ہیں۔ تندرست ماں باپ کا بچہ تندرست اور بیمار کا بیمار پیدا ہو گا اسی طرح آگ کے پاس بیٹھنے والے کے کپڑے گرم ہو جائیں گے اور برف ہاتھ میں پکڑنے والے کا ہاتھ سرد ہو گا۔ مگر ان سیدھی باتوں کو فلسفیوں نے کیسی پریشان کُن الجھنیں بنا دیا اور افسوس ہے کہ مسلمانوں میں بھی بدقسمتی سے یہ خیالات رائج ہو گئے۔ اس کی بنیاد دراصل یہ خیال ہے کہ انسان کی روح باہر سے آتی ہے۔ باہر سے روحیں آنا ماننے کے نتیجہ میں ہی تناسخ وغیرہ عقائد نکلے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ روح کہیں باہر سے نہیں آتی بلکہ انسان کے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیمار جسم سے بیمار بچہ اور تندرست سے تندرست بچہ پیدا ہوتا ہے۔ باہر سے آنا مانیں تو پھر تو بے شک اعتراض ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اسے بری جگہ کیوں رکھ دیا لیکن جب اس کا باہر سے کوئی تعلق ہی نہ ہو تو پھر اعتراض کی کوئی بات نہیں۔ ایک شخص غریب ہے اور اپنے معمولی سے مکان میں رہتا ہے لیکن اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا مگر کسی کے ہاں کوئی معزز مہمان آئے اور وہ اسے پاخانہ میں جگہ دے تو ہر ایک اس پر اعتراض کرے گا۔ غریب شخص کے گھر پر کوئی اعتراض اس لئے نہیں آتا کہ وہ سمجھتا ہے اس نے تو یہیں رہنا تھا لیکن جو باہر سے آیا ہے اسے پاخانہ میں ٹھہرانے پر ہر کوئی اعتراض کرے گا اور کہے گا کہ وہ تو مہمان تھا اس کی عزت کرنی چاہیئے تھی۔ تو روحوں کا باہر سے آنا تسلیم کرنے سے ہی یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اسے خراب جگہ کیوں رکھا گیا؟ لیکن اگر اس کا اندر سے پیدا ہونا ہی مانا جائے تو پھر کوئی اعتراض نہیں۔ ہر قوم کا یہ طریق ہے کہ جب وہ مذہب سے غافل ہو جائے تو ایسے خیالات میں پڑ جاتی ہے۔

ورنہ کوئی اصل مذہب یہ نہیں سکھاتا۔ مَیں ایک منٹ کے لئے یہ نہیں مان سکتا کہ کرشن، رامچندر اور بدھ جیسے خدا رسیدہ لوگ ایسے لغو خیالات میں مبتلا تھے۔ ان کے سامنے تو بہت بڑا کام یعنی دنیا کی اصلاح تھا وہ ان باتوں کی طرف دھیان ہی کیسے دے سکتے تھے؟ انہوں نے دنیا کی اخلاقی، دماغی اور سیاسی اصلاح کرنی تھی اور آئندہ نسلوں کی بھی اصلاح کا کام ان کے سپرد تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس قدر بڑے کام سے ایک منٹ کی بھی فراغت نہیں ہو سکتی کہ ایسے لغو خیالات کی طرف توجہ کی جا سکے۔ انبیاء کے زمانہ میں یہ خیالات پیدا نہیں ہوتے بلکہ بعد میں جب ترقیات حاصل ہو جاتی ہیں تو یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ تیز طبیعت لوگ پامال رستہ کو پسند نہیں کرتے اگر اس رستہ پر چلتے جائیں تو انہیں رام چندر یا کرشن کا شاگرد ہی کہا جائے گا لیکن اگر پتنجلی کا یوگ شاستر بن جائے تو اس آزادیٔ علم کی وجہ سے لوگ مصنف کی تعریف کریں گے اوراس کی خوب شہرت ہو گی۔ پس اس جھوٹی شہرت اورعزت کی خاطر لوگ ایسے رستے تجویز کرتے، خود ٹھوکر کھاتے، گمراہ ہوتے اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن کریم فرماتا ہے کہ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا ۔2؎ یہی حال سامی مذاہب میں ہمیں نظر آتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ ایک سیدھی سادی تعلیم لائے تھے مگر بعد میں یہودیوں نے اس میں عجیب الجھنیں پیدا کر دیں۔ پھر حضرت عیسیٰؑ آئے اور انہوں نے کہا کہ اصلی تعلیم تو وہی ہے جو موسیٰؑ لائے تھے۔ صرف زمانہ کے حالات کا تقاضا ہے کہ نرمی سے کام لیا جائے اور باطنی صفائی کی طرف توجہ زیادہ دی جائے۔ مگر دیکھو نکالنے والوں نے اس میں بھی کیا کیا باتیں نکالیں۔ کسی نے ان کو خدا بنا دیا اور کسی نے خدا کا بیٹا۔ پھر اقانیم ثلاثہ کا گورکھ دھندا گھڑ لیا گیا۔ جسے نہ گھڑنے والے خود سمجھیں اور نہ کوئی اور سمجھ سکے۔ مسلمانوں کو آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جو تعلیم دی تھی اس کے مطابق وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا کام دنیا کی اصلاح کرنا ہے۔ اس لئے وہ ان باتوں کی طرف توجہ ہی نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ اتنا بڑا کام جس کے ذمہ ہو اسے ایسی باتوں کے لئے وقت ہی کہاں مل

سکتا ہے۔ اب ہم وہی کام کرتے ہیں دیکھ لو سر کھجلانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ تو اگر کوئی قوم دیانتداری سے دنیا کی اصلاح میں لگ جائے تو ایسی باتوں کے لئے اسے فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ مگر جب مسلمانوں نے اس کام سے غفلت کی تو یونانی فلاسفروں کی کتابوں کے تراجم کرنے لگ گئے۔ اپنے خیال میں تو وہ علمی ترقی کر رہے تھے مگر میرے خیال میں وہ بدترین جہالت پھیلا رہے تھے۔ خداتعالیٰ کی صفات پر بحثیں اسی زمانہ میں شروع ہوئیں۔ خدا تعالیٰ کا کلام عارضی ہے یا ہمیشہ سے؟ ایسی ایسی بے ہودہ اور لغو باتیں ہونے لگیں۔ پھر خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ذریعہ پھر وہی سیدھا سادہ اسلام دنیا میں آیا اور آپ نے پھر ہمیں یہ بتایا کہ خداتعالیٰ نے جن چیزوں کو پیدا کیا ہے ان کی تحقیقات بیشک کرو۔ یہ سائنس کی ترقی ہے لیکن خدا تعالیٰ خالق ہے اسے اگر پھاڑ کر دیکھنا چاہو گے تو کامیاب نہ ہو سکو گے۔ اگر اسے دیکھنا چاہتے ہو تو اس کا یہی طریق ہے کہ اس کی عبادت کرو اور اس کا قُرب حاصل کرو۔ لیکن اسے پھاڑنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔ ہماری جماعت اگر ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور ان پر عمل کرے تو وہ گرنے سے بچ سکتی ہے۔ مگر مَیں نے دیکھا ہے اب بھی بعض اوقات ایسی بحثیں شروع ہو جاتی ہیں کہ مادہ ازلی ہے یا نہیں۔ مادہ سے تمہیں کیا کہ کب تھا اور کیسے تھا۔ اس مسئلہ کا حل نہ زراعت کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ تجارت یا صنعت و حرفت کو۔ پس ایسی لغو باتوں کی طرف توجہ کی کیا ضرورت ہے؟ اور نہ ان کو کوئی حل کر سکتا ہے۔ بھلا یہ تو کوئی حل کرے کہ دنیا محدود ہے یا غیر محدود! مادہ تو ہمارے سامنے نہیں دنیا تو سامنے ہے۔ پہلے یہ تو طے کرو کہ یہ دنیا محدود ہے یا غیر محدود۔ اگر محدود ہے تو حد کہاں ہے اور جب حد قائم ہو گئی تو پھر اس حد کے متعلق سوال پیدا ہو گا کہ وہ کیا ہے اور محدود ہے یا غیر محدود۔ یہ ہمارے سامنے کے سوالات ہیں جو حل نہیں ہو سکتے۔ تو مادہ کی بحثوں میں وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے کہ کوئی احمق کبھی یہ

نہیں کہتا کہ میں اپنے بیٹے سے اس وقت تک محبت نہیں کر سکتا جب تک اس کا پیٹ چیر کر یہ نہ دیکھ لوں کہ اس کا دل کہاں ہے اور جگر کہاں او رگردے کہاں ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ سے محبت کرنے سے قبل کیوں اسے پھاڑ کر دیکھنا چاہتے ہو؟ اس کی شان و عظمت بالکل جداگانہ ہے اور تمہاری یہ اہلیت اور قابلیت کہاں کہ اسے سمجھ سکو۔ پس جس طرح ایک بھینس غالب کے اشعار کو نہیں سمجھ سکتی تم اس سے بھی کم اللہ تعالیٰ کے متعلق تفاصیل کو سمجھنے کے اہل ہو۔ تمہیں تو بس یہی سمجھنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کا تمہارے ساتھ کیا تعلق ہے وہ تم سے کس طرح خوش ہو سکتا ہے او رکس طرح ناراض۔ بس اتنی ہی بات تمہارے کام کی ہے۔ باقی سب باتیں لغو ہیں اور ان میں وقت ضائع کرنا بالکل بے فائدہ ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ ہماری جماعت کو توفیق دے اور وہ ان باتوں سے بچے تو ایسی مثال دنیا میں قائم کر سکتی ہے جو بے نظیر یادگار ہو۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ جب جماعت ترقی کرے گی تو آئندہ نسلیں اس طرف نہ لگ جائیں گی کہ دنیا کب سے ہے کہاں سے ہے اور پیدا کس طرح ہوئی ہے۔ کم بختو! وہ کس طرح پیدا ہوئی ہے تمہیں یہ کیا فکر ہے؟ تم تو یہ فکر کرو کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ تو زندگی سے اچھے فوائد حاصل کرو۔ ایسے لغو خیالات میں پڑنے والوں نے ہی پہلے مسلمانوں کو تباہ کیا ہے۔ اس لئے ان کے خیالات سے بچو۔ صرف ان باتوں کی طرف توجہ کرو جن کے نتیجہ میں روحانی یا مادی فوائد حاصل ہو سکیں۔ دین کے علاوہ زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی میں مدد مل سکے۔ ان باتوں کی طرف توجہ کرنے کی تو قرآن کریم بار بار ہدایت کرتا ہے مگر لغو باتوں پر وقت ضائع کرنے سے روکتا ہے۔

پس ہماری جماعت خصوصاً نوجوانوں کو یہ نقطہ نگاہ مضبوطی سے پکڑ لینا چاہئے کہ ایسی لغو بحثوں سے بچنا ضروری ہے۔ مَیں نے دیکھا ہے آریوں کی کسی مجلس میں بیٹھے ایسی باتیں سنیں تو خود بھی اسی طرف لگ جاتے ہیں۔ وہ بھی پاگل اور یہ بھی

پاگل۔ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ بھی خدا سے ویسے ہی دور رہیں گے جیسے آریہ وغیرہ ہیں۔ تم اس رستہ پر چل کر کیا حاصل کر سکتے ہو جس پر چلنے سے پہلے کوئی کچھ حاصل نہ کر سکا۔ پس ان باتوں سے بچو۔ بہترین طریق وہی ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات پر غور کرو وہی تمہیں بتا سکتا ہے کہ وہ کس طرح ناراض ہوتا ہے اور کس طرح خوش۔ تمہاری اپنی کوششیں بے سود ہیں۔ اگر وہ تمہاری کوششوں سے تمہارے قابو میں آ جائے تو وہ خدا نہیں تمہارا غلام ہے۔ پس یہی رستہ صحیح ہے اسے مضبوطی سے پکڑو، لغو باتوں سے خود بھی بچو اور علم نما جہالت سے دوسروں کو بھی دھوکا میں نہ ڈالو کیونکہ جو شخص کوئی بدعت جاری کرتا ہے آئندہ جن لاکھوں کروڑوں کے دلوں میں اس سے بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے ان سب کا گناہ اسی کی گردن پر ہوتا ہے۔"

(الفضل 22 فروری 1941ء)

1: البقرۃ: 256

2 : المائدۃ : 78